مشرق شناسی کی روایت اور جرمن مستشرقین

ڈاکٹر جواز جعفری*

Abstract:

In this essay the efforts of German Orientalists for the flowering of Urdu Language and Literature have been analyzed. Although the great European brains seem influenced from Indian literature, philosophy, civilization and ancient thinking yet the German name stands significant in this list. The German had no practical relationship like the Portuguese, the Dutch, the French and the English but it is surprising to note that the first and second grammar books compilers

(John Joshaw Cattler and Benjamin Shultze) were German. The tradition of origentalism has traveled through these German Orientalists upto Dr. Cristina Oster and all these scholars using their head and heart are desparately trying to keep Urdu language and literature alive in foreign countries.

سترہویں صدی کا مغلیہ ہندوستان سیاسی اعتبار سے مستحکم اور مادی وسائل سے مالا مال تھا۔ یہ خطہ اپنے قدیم ترین فکر و فلسفے، علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کے باعث عالمگیر شناخت کا حامل تھا۔ یہاں گندم، چاول، پٹ سن، چائے، صندل، ہزاروں سال پرانے نوادرات، جواہرات اور خوبصورت زیورات کے علاوہ کلکتہ کی ٹیکسٹائل مصنوعات، جنوبی ہند کے گرم مصالحے اور مرشد آباد کی نفیس ململ کی افریقہ اور مشرق وسطیٰ سے لے کر یورپ تک دھوم تھی۔ یہاں کے باشندے پُرامن اور ملنسار تھے اور اپنے جنوبی ساحلوں کے ذریعے مالدیپ، (سری لنکا) جاوا، سماٹرا، افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے۔ یورپی ممالک میں ان کی مصنوعات عرب تاجروں کے توسط سے پہنچتی تھیں، نیز انہی عربوں کے ذریعے ہندوستان کی دیومالائی کہانیاں بھی یورپ میں پھیل گئیں اور ہندوستانی مصنوعات کے ساتھ ساتھ یہاں کے فلسفے، بودوباش اور پُراسراریت میں بھی یورپی اقوام کے لئے ایک انجانی کشش پیدا ہوگئی تھی مگر یہ لوگ سندھ، ملتان اور جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر عربوں کی عسکری برتری کے خوف سے اِدھر کا رخ نہیں کرتے تھے۔

---

* اُستاد شعبہ اُردو، گورنمنٹ ایم اے او کالج، لاہور

جنوبی ہند کی تجارتی منڈیوں سے مسلم اثرات اور اجارہ داری ختم کرنے کے لئے یوں تو کئی یورپی قومیں کوشاں تھیں مگر جس قوم نے سب سے پہلے جنوبی ہند کے ساحلوں کو چھوا، وہ پرتگالی تھے۔ سکندر لودھی کے عہدِ حکومت میں پرتگال سے تعلق رکھنے والا بحری ڈاکو واسکوڈے گاما ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو جنوبی ہند کے مشہور ساحل کالی کٹ پر اترا اور دیکھتے ہی دیکھتے پرتگالی تاجروں نے ہر طرف ڈیرے ڈال لیے۔ تاریخی طور پر جنوبی ہند کے عرب مسلمانوں اور پرتگالیوں میں یہ پہلا رابطہ نہیں تھا بلکہ عربوں، مسلمانوں اور پرتگالیوں میں تہذیبی رشتے ہسپانیہ کے دور ہی سے چلے آ رہے تھے۔ ۱۴۹۳ء میں سقوطِ ہسپانیہ کے بعد ہی اسپین اور پُرتگال وجود میں آئے تھے۔ (۱)

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ غرناطہ کی شکست کے محض چھ سال بعد ہی پرتگالی الاصل واسکوڈے گاما ہندوستان تک آ پہنچا جبکہ اسی سال کولمبس نے امریکہ دریافت کرلیا۔ گویا بیک وقت مشرق ومغرب کی طرف، یورپی تہذیب وتمدن کے عروج کا دور شروع ہوا ہے۔ (۲)

۱۵۴۰ء تک مغربی اور وسطی ہند کی اہم بندرگاہوں پر پرتگالی قابض ہو چکے تھے۔ ان لسانی وانتظامی روابط کے نتیجے میں جو اثرات مرتب ہوئے وہ دوطرفہ تھے۔ ایک طرف پرتگالی زبان کے الفاظ مقامی زبانوں میں راہ پانے لگے تھے اور دوسری طرف اُردو زبان کے چرچے بھی یورپ تک سنائی دینے لگے تھے۔

اس وقت کے پرتگال کو پورے یورپ پر سیاسی برتری حاصل تھی اور اس کے سیاسی وتہذیبی اثرات کو یورپ کے دیگر ممالک پر بھی واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ایک رائے کے مطابق اردو زبان، پرتگال ہی کے ذریعے یورپ میں پھیلی۔ پرتگالی ایسٹ انڈیا کمپنی کے منشور کی رو سے ہر پادری کے لئے ہندوستان جانے سے قبل اُردو زبان کا سیکھنا لازم تھا۔ اُدھر پرتگالی زبان بھی ہندوستان کے وسیع علاقوں (مدراس، بمبئی اور کلکتہ) میں بولی اور سمجھی جانے لگی تھی۔ یہ زبان نہ صرف پرتگالیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان ذریعہ اظہار تھی بلکہ یورپ کی دیگر اقوام بھی اسے رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ مولوی عبدالحق کے بقول اس دور میں پرتگالی زبان ہندوستان کی تمام بندرگاہوں میں لنگوا فرینکا (مشترکہ زبان) کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ (۳)

پرتگالیوں کے بعد، ڈچ، فرانسیسی اور انگریز ہندوستان آئے، ان اقوام کے درمیان اقتدار اور تسلط کے لئے کئی خونریز معرکے بھی ہوئے مگر بالآخر میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ یورپی اقوام کی ہندوستان آمد کا اوّل وآخر مقصد یہاں کے مادی وسائل کی لوٹ مار ہی رہا تھا مگر ان کے انتظامی اقدامات کے نتیجے میں بلاواسطہ طور پر ہندوستان کی مقامی زبانوں کو بھی فائدہ پہنچا۔

سولھویں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی کی بجا طور پر یورپ میں مشرق شناسی کا عہد قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس زمانے میں یورپ کے بڑے بڑے دانشور مشرقی فکر وفلسفے سے متاثر ہوئے اور انہوں نے عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، اُردو، ہندی اور دیگر زبانوں کے بارے میں تحقیق وجستجو کی ایک عظیم روایت کا آغاز کیا۔ فرانس کا ناول نگار وکٹر ہیوگو مشرقی فکر وفلسفے سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے گوئٹے کی طرز پر بیاض مشرق (لے زوغیانتال) کے نام سے نظموں کا پورا مجموعہ ترتیب دیا(۴) جس میں وہ مشرق کے عظیم شعرا حافظؔ، سعدیؔ، رومیؔ اور ابوانوس سے استفادے پر فخر کا اظہار کرتا ہے۔

۱۹۴۵ء میں لاہور میں ایفرو ایشیائی اہلِ قلم، دانشوروں اور فنکاروں کا ایک سیمینار منعقد ہوا تھا جس میں تھائی لینڈ کی مندوب مسز گسیما نکٹ نے اپنے مضمون میں مغرب کے بڑے بڑے اذہان کی مشرقی طرزِ فکر سے اثر پذیری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سترہویں صدی میں جرمنوں نے فارسی کے تراجم کئے، اٹھارہویں صدی میں فرانسیسیوں نے الف لیلیٰ کو فرانسیسی زبان کا پیراہن پہنایا۔ جرمنی میں شوپنہار، بدھ اور ہندو فلسفے سے متاثر ہوا اور انگلستان کا ہر پڑھا لکھا شخص عمر خیامؔ کی شاعری سے واقف ہے۔

یورپ میں تقابلی لسانیات کا آغاز قبل مسیح سے ہو گیا تھا۔ معروف جرمن گرائمر نویس مارکس نیز نطیونس ایک صدی قبل مسیح میں یونانی اور لاطینی زبانوں کے درمیانی مماثلتوں کی نشاندہی کر چکا تھا۔(۵) بعدازاں جوسٹس شلیگر، ڈان ایڈلنگ اور بوناونیتو رالگانیوس نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ (۶)

اٹھارہویں صدی میں سنسکرت زبان کے چرچے یورپ میں اس وقت ہوئے جب ممتاز مستشرق اور منتظم سر ولیم جونز نے ۲۷ ستمبر ۱۷۸۶ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے تیسرے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے سنسکرت کی قدامت اور یونانی ولاطینی کے مقابلے میں اس کی جامعیت، شائستگی، لطافت اور تینوں قدیم زبانوں کے ایک ہی سرچشمے سے تعلق، نیز فارسی کے ساتھ ان زبانوں کے گہرے روابط کا اعلان کیا۔(۷)

یورپ کی اپنی زبانیں مشرق میں آکر زیادہ کارآمد نہ رہی تھیں، چنانچہ اہل یورپ نے مقامی زبانوں کی سرپرستی کرتے ہوئے اورینٹل سیمنری، بنارس کالج، دہلی کالج اور اورینٹل کالج لاہور جیسے اداروں کا اجراء کیا۔ مقامی زبانوں کے حوالے سے ہونے والی سرگرمیوں کے نتیجے میں دو طرح کے یورپین سامنے آئے۔ ایک قسم کے لوگ وہ تھے، جو ہندوستان کے فکر وفلسفے، طرزِ زیست اور یہاں کے بھیدوں کو جاننے کی خواہش دل میں لئے اس سرزمین پر وارد ہوئے جبکہ لوگوں کی ایک بھاری اکثریت ایسی تھی، جو ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھ کر اپنا مستقبل سنوارنے یہاں آئی تھی۔ ان کے عزائم بالکل ایسے ہی تھے، جیسے آج پاک وہند کے لوگوں کی اکثریت یورپ جانے کے لئے بے قرار نظر آتی ہے مگر ۱۸۲۳ء تک ہندوستان میں داخل ہونا اتنا آسان نہیں تھا۔ یہاں داخلے کے لئے باقاعدہ

اجازت نامے کی ضرورت ہوتی تھی، اجازت نامے کے بغیر یا کسی بھی غیر قانونی ذریعے سے آنے والوں کو اگلے ہی جہاز سے واپس ڈی پورٹ کر دیا جاتا تھا۔ دوسری صورت میں ایسے لوگوں کو قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کے ساتھ وہی سلوک ہوتا تھا جو آج غیر قانونی طور پر یورپ جانے والے کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا۔ (۸)

ہندوستان پر یورپی حکمرانی کے اس پورے عہد میں سر ولیم جونز، جان گلکرسٹ، گارسین دتاسی، جان جوشوا کٹیلر، بنجمن شلزے، آلوئیس شپرینگر، ہامر پورگ شٹال، ریونڈ مارتیور یپا، جان شیکسپیئر، براؤن، پروفیسر آرتھونی، الیگزینڈر رباؤ سانی اور بہت سے نامور مستشرقین سامنے آئے۔

مشرق شناسی کی اس عظیم روایت کو رالف رسل، ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز، ارسلا روتھن، مریم سلگانگ، نتالیہ پریگارینا، لدڈ میلا واسی لیوا، کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ اور بہت سے دوسرے مشرق شناس آج بھی قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں دلچسپ امر یہ ہے کہ پرتگال، ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ تو مختلف ادوار میں ہندوستان پر قابض رہے، جس کے نتیجے میں ان ممالک کے پڑھے لکھے افراد کو یہاں کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے مطالعے کے مواقع میسر رہے مگر جہاں تک جرمنی کا تعلق ہے اس کا ہندوستان سے اس قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا، اس کے باوجود جرمن علماء نے مشرق شناسی کے حوالے سے شاندار کارنامے انجام دیئے۔ اُردو زبان کے ابتدائی قواعد کی تدوین کا سہرا جان جوشوا کٹیلر اور بنجمن شلزے جیسے جرمن علماء ہی کے سر جاتا ہے۔

جان جوشوا کٹیلر (ہالینڈ) ۱۶۵۹ء میں پرشیا کے شہر ایل بنجمن میں پیدا ہوا جبکہ منیر الدین احمد کے ''اخبار اردو'' کے فروری ۱۹۹۱ء کے شمارے میں چھپنے والے ایک خط کے مطابق کٹیلر جرمن تھا اور پرشیا (جو جرمنی کے شمالی علاقوں پر مشتمل مملکت کا نام تھا) کا رہنے والا تھا۔ منیر الدین احمد کے موقف کی تائید اکرام چغتائی نے بھی کی ہے۔ ان کے بقول یہ عجیب بات ہے کہ سترھویں صدی عیسوی کے آخر اور اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں اردو کی جو قواعد مرتب ہوئیں، ان کے مولفین کا تعلق ان مغربی اقوام کی بجائے جرمن بولنے والے علاقوں سے تھا۔ ان میں سے ایک جان جوشوا کٹیلر ہے جو ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہا۔ اس کی تیار کردہ قواعدِ اردو ابھی تک اشاعت پذیر نہیں ہو سکی۔ اس کا واحد قلمی نسخہ ہیگ کے مرکزی کتاب خانہ کی زینت ہے۔ (۹) خلیل الرحمٰن داؤدی کی تحقیق کے مطابق ہندوستانی (اردو) کی سب سے پہلے قواعد کے مرتب جان جوشوا کٹیلر کا تعلق ہالینڈ سے تھا۔ (۱۰) جوشوا کٹیلر ہالینڈ کے سفیر کی حیثیت سے مغل بادشاہ بہادر شاہ کے دربار میں (۱۲۔۱۷۰۸ء) اور پھر ۱۷۱۲ء میں جہانداد کے دربار سے منسلک رہا۔ وہ بطور سفیر دلّی کے راستے لاہور اور آگرے سے بھی گزرا، جہاں ولندیزی کمپنی کا کارخانہ تھا۔ ولندیزی وفد ۱۰ ستمبر ۱۷۱۱ء کو لاہور کے قریب پہنچا اور مغل بادشاہ جہانداد کے ساتھ دلّی واپس

ہوا۔ بعد ازاں یہ وفد آگے سے ہوتا ہوا سورت پہنچا۔ (۱۱)

۱۷۱۶ء میں کٹیلر ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ناظم تجارت مقرر ہوا اور تین سال تک اس عہدے پر کام کرتا رہا۔ اسی ملازمت کے دوران اسے ایران کا سفیر بنا دیا گیا اور وہ اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے ایران روانہ ہو گیا۔ اصفہان سے واپس آتے ہوئے عربوں پر حملے میں ایرانی گورنر کی مدد نہ کرنے کے جرم میں اُسے قید کر لیا گیا، جہاں وہ دو روز بعد ۱۷۱۸ء میں انتقال کر گیا۔ مولوی عبدالحق نے مقام وفات تک خلیج فارس لکھا ہے۔ کٹیلر پہلا یورپی ہے، جسے اُردو زبان کی سب سے پہلی قواعد لکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ کتاب (ہندوستانی قواعد) پروفیسر حامد حسن قادری کی تحقیق کے مطابق ۱۷۴۴ء میں شائع ہوئی جبکہ مولوی عبدالحق اس کا زمانہ تصنیف ۱۷۱۵ء اور سال اشاعت ۱۷۴۳ء بتاتے ہیں، جب ڈیوڈمل کے ہاتھوں یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ ادھر شفقت رضوی بھی مولوی عبدالحق کے ہم خیال ہیں اور انہوں نے بھی اس کتاب کا سنِ اشاعت ۱۷۴۳ء ہی لکھا ہے۔ (۱۲)

۱۷۱۵ء میں اس نے قواعد ''اردولنگو ہندوستانیکا'' لاطینی زبان میں لکھی مگر ہندوستانی الفاظ اور عبارتیں رومن رسم الخط میں ہیں۔ کتاب میں حضرت عیسیٰؑ کی مشہور دعا کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ خلیل الرحمٰن داؤدی کے مطابق اس کتاب کے ہندوستانی الفاظ فارسی رسم الخط میں ہیں جبکہ مولوی عبدالحق کا کہنا ہے کہ کتاب لاطینی میں ہے لیکن ہندوستانی الفاظ رومن حروف میں ہیں جبکہ الفاظ کی املا ولندیزی طرز پر ہے۔ کٹیلر کی اس کتاب پر اغلاط کے اعتراضات ہوئے ہیں مگر آغا افتخار حسین کے نزدیک ایسا ہونا خارج از امکان نہیں کہ بہر حال اس حوالے سے یہ پہلی کوشش ہے۔ گریرسن نے اس کے دیوناگری رسم الخط کے نمونوں کی کچھ تصویروں اور حضرت عیسیٰؑ کی دعا کے اردو ترجمے کو اس کی ممتاز خوبی شمار کیا ہے کیونکہ ان کے بقول یہ کسی ہندوستانی زبان میں کسی یورپی کا پہلا ترجمہ ہے۔ ہندوستان کی قدیم رسومات و روایات کے مطالعے، مذاہب کی تحقیق، مقامی بولیاں سیکھنے اور ان کے قواعد مرتب کرنے کے حوالے سے جرمن مستشرقین بہت نمایاں ہیں۔ منیرالدین احمد کے نزدیک جرمن قوم سے مراد جرمن زبان و ثقافت سے وابستہ افراد ہیں، جو جرمنی، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ اور آس پاس کے دوسرے ملکوں میں آباد ہیں۔ موصوف کے بقول بنجمن شلزے کا آبائی وطن جرمنی ہے (۱۳) جبکہ ایم اقبال اختر اس سلسلے میں مختلف رائے کا اظہار کرتے ہیں ان کے نزدیک ڈنمارک اور اردو کا تعلق بہت پرانا ہے۔ بنجمن شلزے، جنہوں نے ابتدائی دور کی اردو گرائمر اور کئی دوسری کتابیں لکھیں، ڈنمارک ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ (۱۴)

بنجمن شلزے ۱۷۱۹ء میں پادری بن کر جنوبی ہندوستان پہنچا اور ۲۴ برس تک یہاں مقیم رہا۔ اس دوران اس نے تلگو، تامل، اردو اور دیگر ہندوستانی زبانی سیکھیں۔ انجیل مقدس کا پہلا اردو ترجمہ بھی اسی سے منسوب سمجھا جاتا

ہے۔ اردو زبان کے حوالے سے اس کا شاندار کارنامہ ''ہندوستانی زبان کی گرائمر'' ہے، جسے کٹیلر کے بعد اردو کی دوسری گرائمر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس پروٹیسٹنٹ پادری کی اس کتاب کا ایک انگریزی ترجمہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں محفوظ ہے، جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ۱۹۷۷ء میں لاہور سے شائع کیا۔ یہ قواعد لاطینی زبان میں تھی اور اس کا اصل متن مشرقی جرمنی کے شہر ہالے سے ۱۷۴۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب ٹائپ میں چھاپی گئی تھی۔ اگلے سال ۱۷۴۸ء میں یہ لائپزگ سے بھی شائع ہوئی۔ حامد حسن قادری اور مولوی عبدالحق اس کا سال اشاعت ۱۷۴۴ء بتاتے ہیں جبکہ عتیق صدیقی کے نزدیک سن اشاعت ۱۷۴۵ء ہے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق شلزے کی گرائمر ہندوستانی زبان میں ہے مگر ہندوستانی الفاظ فارسی میں اور ان کا تلفظ لاطینی میں دیا گیا ہے جبکہ دیوناگری حروف کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ بعض حروف بالکل ترک کر دیئے گئے ہیں، البتہ وہ ضمائر کے درست استعمال سے بھی واقف لگتا ہے لیکن افعال مستعدی کے زمانہ ماضی کے ساتھ ''نے'' کے استعمال سے آگاہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ صرف اس کے ساتھ نہیں بلکہ اس عہد کے اکثر قواعد نویس اس سے بے خبر نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کا اصل متن دستیاب نہیں، اب صرف انگریزی ترجمہ موجود ہے۔

شلزے کا تعلق ایک اور کتاب کی اشاعت سے بھی رہا ہے۔ یہ کتاب جان فریڈرک کی تھی، جو ۱۷۴۱ء میں لائپزگ سے شائع ہوئی شلزے نے اس کا دیباچہ لکھا تھا۔ اس عجیب وغریب کتاب میں سو سے زائد زبانوں کے حروف تہجی دیئے گئے ہیں۔ دو تین صفحے اردو ابجد اور فارسی عربی حروف کے استعمال سے متعلق بھی ہیں، اس کے علاوہ حضرت عیسیٰؑ کی دعا کا ترجمہ اردو (ہندوستانی) تلفظ کے ساتھ دیا گیا ہے۔ شلزے کی کتاب کا ترجمہ ڈیوڈمل نے کیا تھا۔ اس نے ۱۷۴۳ء میں اپنی کتاب ''ڈیذ ٹیشنز آف شیکز'' شائع کی شلزے نے کتاب پیدائش کے پہلے چار ابواب کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ یہ کتاب ۱۷۴۶۔۱۷۴۵ء میں شائع ہوئی۔ آغا افتخار حسین نے اپنی کتاب ''یورپ میں اردو'' میں اس کے بارے میں تفصیلات دیتے ہوئے بتایا ہے کہ اس لُغت میں ترپین الفاظ کے معانی کا گیارہ زبانوں میں تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔

جرمن مستشرقین میں آلوئیس شپرینگر (آسٹریا) کا نام بھی خاصا ممتاز ہے۔ آسٹریا، جسے آرٹسٹوں، شاعروں اور ادیبوں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے، اٹلی، چیک ریپبلک، سلواکیہ، ہنگری، سوئٹزرلینڈ، سلووانیہ اور جرمنی کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ یہاں کی زبان جرمن ہے، جسے ۹۱ فیصد آبادی وسیلہء اظہار بنائے ہوئے ہے۔ آسٹریا مختلف ادوار میں مختلف مملکتوں کے زیر اثر رہا ہے، جن میں جرمنی سرفہرست ہے۔ دسویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی عیسوی تک یہ علاقہ رومن شہنشاہیت کے زیر اثر رہا۔ چودھویں اور پندرھویں صدیوں کے دوران آسٹریا کچھ

عرصے کے لئے جرمن قلمرو میں شامل تھا مگر بعد میں آسٹرین نے اسے آزاد کرالیا مگر غیر ملکی اثر پھر بھی موجود رہا۔ ۱۹۱۹ء میں آسٹریا کا نام ریپبلک آف جرمن آسٹریا تھا، جسے بعدازاں ریپبلک آف آسٹریا کا نام دیا گیا مگر اس کے باوجود یہ جرمنوں کے زیر اثر ہی رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب جرمنی کمزور ہوگیا تو اس صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آسٹریا نے ۱۹۵۵ء میں مکمل آزادی کا اعلان کر دیا۔ سپرینگر کو ہم اس لئے جرمن کہیں گے کہ اس کی زندگی (۱۸۱۳ء۔۱۸۹۰ء) میں آسٹریا جرمن قلمرو ہی کے زیر نگیں تھا۔ ٹائرول میں پیدا ہونے والے سپرینگر نے ابتدائی تعلیم آئسبرگ اور ویانا میں حاصل کی، اسے بچپن ہی سے مشرقی زبانوں سے دلچسپی تھی، حصول تعلیم کے بعد روزگار کی تلاش اسے انگلینڈ لے گئی، جہاں وہ ۱۸۴۳ء میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی میں نائب سرجن بھرتی ہوکر ۱۸۴۵ء میں قسمت آزمائی کے لئے ہندوستان چلا آیا۔ عربی اور فارسی زبانیں تو وہ پہلے ہی جانتا تھا۔ یہاں آکر اس نے ہندوستان کی مقبول ترین زبان اردو سے خصوصی شغف کا اظہار کیا۔ سپرینگر کی آمد کے تھوڑے ہی عرصے بعد اسے دہلی کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا، یہاں اس نے اردو زبان وادب کی ترقی کے لئے متعدد اقدامات کئے، دلّی کے مسلمان اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور یہاں کے نامور اہلِ قلم سے اس کے ذاتی مراسم تھے۔ ان میں سے بیشتر اہلِ قلم کے تصنیفی منصوبوں میں اس کی مشاورت شامل تھی۔ ان میں سے بہت سے قلمکاروں کے اس کے نام یادگار خطوط ہیں، جو برلن کی مرکزی لائبریری کے ذخیرہ سپرینگر میں محفوظ ہیں۔

سپرینگر نے اپنے تدبر اور انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر دہلی کالج کو ایسا عروج بخشا، جس نے آگے چل کر شمالی ہند کے مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ ساری زندگی مشرق کے علمی خزانوں کو مغرب میں اور مغرب کے سائنسی طرز فکر کو مشرق میں متعارف کرانے کے لئے کوشاں رہا۔ اس کے اس عمل کے پیچھے دونوں خطوں کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی آرزو کارفرما تھی۔ سپرینگر نے دہلی میں لیتھو پریس لگا کر مقصدی صحافت کا آغاز کیا اور جرمنی کے مقبول رسالے ''پینی میگزین'' کے سٹائل میں ''قران السعدین'' (ہفت روزہ اردو میگزین) جاری کیا، جس کا پہلا شمارہ فروری ۱۸۴۵ء کو منظرِ عام پر آیا۔ علاوہ ازیں ۱۸۴۸ء میں اسے سرکاری طور پر نوابان اودھ کے کتب خانے کی فہرست تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی جس کی ایک جلد ۱۸۵۴ء میں شائع ہوئی مگر بدقسمتی سے باقی مسودات ضائع ہو گئے۔ ۱۸۵۵ء میں وہ خرابی صحت کی بنا پر شملہ چلا گیا اور یہیں سے اس کی خدمات حکومت بنگال کے سپرد کر دی گئیں۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اردو زبان وادب کے لئے اس کی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ سپرینگر نے دہلی ورنیکلر سوسائٹی کے معتمد اور روحِ رواں کی حیثیت سے اردو کی بڑی خدمت

کی۔ اس نے تاریخ بمبئی کو مرتب کر کے چھپوایا، حماسا اور متنبّی کے نسخے بہم پہنچا کر عربی کے نصاب کو تقویت دی۔ علاوہ ازیں دہلی کالج میں اردو کو ذریعہ تعلیم برقرار رکھ کر شاندار نتائج حاصل کئے۔ اس نے عربی اور فارسی سے اردو ترجمے کرنے کے طریقے کی اصلاح کی تجویز پیش کی اور شعبہ مشرقی کے نصاب میں مغربی علوم کی تعلیم کو داخل کرایا، جس کے لئے متعدد انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا گیا۔ اس نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے معتمد اور فورٹ ولیم کالج کے ممتحن کی حیثیت سے بھی اردو زبان اور مشرقی علوم کے فروغ میں حصہ لیا۔ سپرینگر کی اپنی خدمات کے اعتراف میں ممتاز مستشرق گارسین دتاسی نے اپنے کئی خطبوں میں اسے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ (۱۵)

سپرینگر کو قلمی نسخے جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اور اس مقصد کے لئے اس نے یورپ اور مشرق وسطیٰ سمیت کئی دیگر ممالک کا سفر بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ۱۸۵۴ء میں ہندوستان چھوڑ کر جرمنی روانہ ہوا تو اس کے ہمراہ دو ہزار کی تعداد میں نادر مخطوطات بھی تھے۔ اس کی اپنی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس کے پاس اردو مخطوطات کی تعداد ۳۵ تھی، جو آج بھی برلن کے مرکزی کتب خانے میں محفوظ ہیں کیونکہ جرمنی پہنچنے کے بعد اس نے اپنا علمی ذخیرہ اس لائبریری کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ منیر الدین احمد کے بقول ان مسودات میں ۹۵ مسودے اردو زبان کے تھے، جن میں سے ۳۵ باقی بچے ہیں۔ ان مسودات کی کیٹلاگ مجاہد حسین زیدی نے تیار کی ہے۔ جرمنی واپسی کے بعد سپرینگر کو سوئٹزرلینڈ کے دارالحکومت برن کی ایک یونیورسٹی میں علوم شرقیہ بالخصوص مطالعہ اسلامی کے پروفیسر کی ملازمت مل گئی مگر یونیورسٹی کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یہاں اردو بھی پڑھاتا رہا۔ اردو زبان و ادب کے لئے بے بہا خدمات انجام دینے والے اس مستشرق کا انتقال ۱۸۹۰ء میں ہوا۔

ہامر پورگ شٹال کو جرمن مستشرقین کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اسے یورپ کی شرقیات کی تاریخ میں نہ صرف بلند مرتبہ حاصل ہے بلکہ جرمن زبان و ثقافت سے وابستہ ممالک میں اسے وہی مقام حاصل ہے، جو انگلستان میں سر ولیم جونز کو دیا جاتا ہے۔ وہ ۱۷۷۴ء میں آسٹریا کے ایک شہر گرتس (Gratz) میں پیدا ہوا، اس کا اصل کام ترکی اور فارسی زبانوں میں ہے۔ ترکی کی تاریخ، زبان اور ثقافت کے علاوہ فارسی زبان و ادب پر بھی اس کی کتابیں موجود ہیں۔ ہامر پورگ شٹال نے دیوان حافظ کو جرمن جامہ پہنایا۔ اسی کے مطالعے سے گوئٹے کے دیوانِ مشرقی نے جنم لیا تھا۔ وہ ترکی عربی اور فارسی زبانیں روانی سے بولتا تھا جبکہ ڈاکٹر این میری شمل کے مطابق وہ اردو زبان بھی جانتا تھا۔ ہندوستان کے بعض اہلِ قلم اسے اپنی اردو کتابیں بھجوایا کرتے تھے اور یہاں کے معتبر رسائل میں اس کی تحریریں شائع ہوئی تھیں۔ ہامر نے ویانا سے شائع ہونے والے ایک ادبی جریدے (Viener Literature Zeitung) کے نومبر ۱۸۱۶ء کے شمارے میں جان شیکسپیئر کی ہندوستانی گرائمر اور ٹامس روبک کی لغت کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا ہے۔

جس سے اردو زبان پر اُس کی مضبوط گرفت کا پتہ چلتا ہے۔ سپرینگر بھی اُس کے شاگردوں میں سے تھا۔ ہامر کا انتقال ۱۸۵۶ء میں ویانا میں ہوا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمن زبان بولنے والے علاقوں میں اردو زبان سیکھنے کا رجحان بڑھ گیا اور کچھ فوجی یونٹوں میں تدریس اردو کا انتظام بھی کیا گیا۔ اس ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے معروف جرمن مستشرقین اورٹوشیش اور ارنسٹ بائرت نے مل کر ایک جدید قواعد ترتیب دیا تھا، جو جنگ کے بعد ۱۹۴۵ء میں لائپسنگ سے شائع ہوا۔ ارنسٹ ویانا یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کا استاد تھا، اس کی سوانح اور تالیفات بتدریج پردہ گمنامی میں ہیں، وہ عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان پر بھی مکمل عبور رکھتا تھا۔ مذکورہ لغت کی اشاعت سے ایک سال قبل مکتوب نویسی اور اس کے متنوع اسالیب پر ایک علیحدہ کتاب ترتیب دی جو لائپسنگ سے شائع ہوئی۔ اس نے اقبال کی مشہور نظموں شکوہ اور جواب شکوہ کا انگریزی ترجمہ بھی کیا، جو اسلام ان ماڈرن پوئٹری کے عنوان سے سوئٹزرلینڈ کے مجلّے Anipropose میں شائع ہوا، یہ ترجمہ یورپ میں اقبال کے ابتدائی تراجم میں شمار ہوتا ہے۔ آسٹریا کی ۱۸۴۷ء میں قائم ہونے والی اکادمی برائے علوم سے شائع ہونے والے رسائل میں کبھی کبھی اردو زبان و ادب پر مقالات بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ ویانا یونیورسٹی اورینٹل انسٹیٹیوٹ میں عربی فارسی اور ترکی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی تدریس کا انتظام بھی موجود ہے۔ ۱۹۵۸ء میں قائم ہونے والے ادارے ہامر پوگ اشٹال سوسائٹی میں بھی اردو سمیت تمام زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔

آدلانگ کا شمار بھی نامور جرمن مستشرقین میں ہوتا ہے۔ اس نے ۱۸۰۶ء میں Meth Ritdates کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی، جس میں اٹھارھویں صدی تک اردو زبان وادب کے بارے میں حاصل ہونے والی معلومات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ اردو زبان کی ساخت کے حوالے سے اپنی طرز کی پہلی اور منفرد کتاب ہے۔ آدلانگ اردو زبان کے لئے مورس کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ ایک زمانے میں یورپ کے مستشرقین اردو کو مور کہا کرتے تھے، غالباً اس نے مور کے ساتھ ''س'' کا اضافہ کر کے اسے مورس بنا لیا ہے۔ انیسویں صدی کے ایک اور جرمن مستشرق برگانے بھی اردو زبان سے شغف کا اظہار کیا ہے۔ ۱۸۵۹ء میں اس نے ''ہندوستانی میں ہاکاری آوازوں کے بارے میں'' کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر ونٹرنز پچھلی صدی کے ایک اور معروف جرمن مستشرق تھے انہوں نے جرمن زبان میں ''ادبیات ہندوستانی'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی، جو اردو زبان وادب کی نہایت اہم تاریخ ہے اور اسے ڈاکٹر ونٹرنز کا شاندار کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

ان نامور مستشرقین کے علاوہ این میری شمل کے نام سے کون واقف نہیں ہے، ان کی کتابیں پاک و ہند

میں آسانی سے دستیاب ہیں۔ اردو کے حوالے سے ان کا بیشتر کام انگریزی اور جرمن زبانوں میں ہے، تاہم وہ اردو بھی روانی سے بول سکتی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے غالب کی فارسی اور اردو شاعری کے تراجم بھی کئے ہیں مگر ان کا بنیادی عشق اقبال ہے۔ اقبالیات پر ان کی بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر این میری شمل بون اور ہارورڈ یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دیتی رہی ہیں اور ابھی چند سال پیشتر ان کا انتقال ہوا ہے۔

ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ آج کی جرمنی کی ممتاز مستشرق ہیں۔ وہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کی چیئر پرسن ہیں۔ اردو زبان نہایت روانی سے بولتی ہیں۔ ان کا ہینڈ رائٹنگ اہل زبان سے بھی زیادہ خوبصورت ہے، جس کا ثبوت وہ خطوط ہیں جو انہوں نے تحقیقی مقالے کے دوران معلومات کے تبادلے کے دوران مجھے لکھے۔ ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کا خصوصی میدان تحقیق ہے۔ انہوں نے ہیمبولٹ یونیورسٹی سے قراۃ العین حیدر کے ناولوں پر ڈاکٹریٹ کر رکھی ہے۔ وہ کئی بار پاکستان کے مطالعاتی دورے پر آ چکی ہیں۔

ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر کے علاوہ ارسلا ورتھن، فریڈریشن روزن، ہوبرٹ جانسس، فریڈرک فرٹز، پروفیسر گلوٹ، لوپراختو، اے سی ماڈل اور اوسپس بھی موجودہ عہد کے جانے پہچانے مستشرقین ہیں۔ علاوہ ازیں جرمنی کی درجن بھر درسگاہوں میں اردو زبان کی تدریس کا انتظام موجود ہے (یا پھر رہا ہے)، ایسی درسگاہوں میں ہیمبولٹ یونیورسٹی، نوٹنکن یونیورسٹی، ہیمبرگ یونیورسٹی، ورنزبرگ یونیورسٹی، بون یونیورسٹی، برلن یونیورسٹی، اوپن یونیورسٹی، میونخ یونیورسٹی، ہیڈگادز برگ کا مشرقی انسٹی ٹیوٹ اور ہائیڈل برگ جیسی ممتاز درسگاہیں شامل ہیں، جن میں اردو زبان کی کل وقتی/ جز وقتی لیکچرر شپ قائم ہے۔ جرمنی میں سترہویں صدی میں شروع ہونے والا مشرق شناسی کا یہ سفر آج پانچویں صدی میں داخل ہو چکا ہے۔ اردو زبان جس کا مستقبل اس کے اپنے خطے میں زیادہ روشن نظر نہیں آتا جرمن مستشرقین اسے آج بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ نئی صورتحال میں بیرون ممالک اردو زبان و ادب کا مستقبل اگرچہ زیادہ تابناک نہیں ہے مگر اہلِ جرمن آج بھی برصغیر سے باہر اردو زبان کے اس ڈوبتے ہوئے جزیرے پر اپنے حصے کی مٹی ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عطش دُرانی، ڈاکٹر، اُردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، سنگ میل پبلشرز لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲

۲۔ آغا امیر حسین، یورپ میں تحقیقی مطالعے، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۲

۳۔ مولوی عبدالحق، اہلِ یورپ نے اُردو کی کیا خدمت کی، رسالہ اردو انجمن ترقی اُردو ہند، اورنگ آباد دکن، جنوری ۱۹۲۴ء

۴۔ آغا افتخار حسین، یورپ میں تحقیقی مطالعہ، ص ۲۴۲۔

۵۔ عین الحق فرید کوٹی، اُردو کی قدیم ترین تاریخ، ارسلان پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۲، ص ۱۱۹۰

۶۔ ایضاً

۷۔ رضیہ نور محمد، اُردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مکتبہ خیابانِ ادب لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۶۱

۸۔ اُردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، عطش درانی، ص ۴۵

۹۔ اکرام چغتائی، آسٹریا میں اُردو، بیرون ممالک میں اُردو، مرتب انعام الحق جاوید، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۲۲۵

۱۰۔ خلیل الرحمٰن وادی، قواعدِ زبانِ اُردو، مشہور رسالہ گلکرسٹ، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۴، ۵

۱۱۔ عطش دُرانی، ڈاکٹر، اُردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۴۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۳۔ منیر الدین احمد، جرمنی میں اُردو، بیرونی ممالک میں اُردو، ص ۲۴۹

۱۴۔ ایم اقبال اختر، ڈنمارک میں اُردو (مضمون) بیرونی ممالک میں اُردو، ص ۳۱۹

۱۵۔ محی الدین قادری، ڈاکٹر، گارسین دتاسی اور اس کے ہمعصر بہی خواہان اُردو، سب رنگ کتاب گھر حیدر آباد دکن، ۱۹۴۷ء، ص ۹۳، ۹۴۔

☆☆☆